رجسٹرڈ نمبر ایل ۹۲۲
فون نمبر ۲۹

ایڈیٹر

آل احمد سرور

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

قیمت سالانہ چھ روپے
قیمت فی کاپی [illegible] پیسے

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۲ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۲۹

آل احمد سرور

ڈبلو۔ ایچ۔ آڈن

(۱۹۰۷ — ۱۹۷۳)

"تم ہماری طرح سادہ لوح تھے، پھر بھی تمہارا کمال باقی رہ گیا مالدار عورتوں کا کلیسائی حلقہ، جسم کا زوال، خود تم (نہ بچ سکے) مخبوط الحواس آئرلینڈ نے تمہیں وہ زخم پہنچائے کہ تم شاعر بن گئے اب آئرلینڈ کے پاس اس کی دیوانگی اور اس کا موسم رہ گیا ہے کیونکہ شاعری کچھ کرتی نہیں ہے، یہ اپنی گفتار کی وادی میں زندہ رہتی ہے، جہاں انتظامیہ کے افسر کبھی خلل انداز ہونا پسند نہ کریں گے یہ جنوب کو مڑ جاتی ہے، علٰحدگی کے بازاروں اور مصروف غموں سے (اور) بے ہنگم شہروں سے جن میں ہم عقیدہ رکھتے ہیں اور جن میں مرتے ہیں، دور (بہت دور) یہ باقی رہ جاتی ہے، ایک واردات کے طور پر یا ایک منھ میں زبان بن کر"

۱۹۳۹ء میں آڈن نے ڈبلو۔ بی۔ ییٹس پر تین نظمیں لکھی تھیں۔ اُن میں جو سب سے چھوٹی اور موثر نظم ہے اُس کا ترجمہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ یہ نظم ییٹس، آڈن اور خود شاعری، تینوں پر بڑا اچھا تبصرہ ہے۔ اس صدی کی چوتھی دہائی میں انگلستان میں جو شاعر اُبھرے اُن میں آڈن اسپنڈر، میک نیس اور سی۔ ڈے۔ لیوس پر لوگوں کی نظریں جم گئیں۔ مگر شاید یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان میں جس کا تخلیقی شعلہ سب سے زیادہ توانا تھا اور جو آخر تک گرمی اور روشنی دیتا رہا، وہ آڈن ہی تھا۔ اس نے حال ہی میں کسی سے کہا تھا کہ لوگ اینگلو امریکن شاعری کے زوال کی خواہ مخواہ بات کرتے ہیں۔ جب اس نے اس صدی میں تین بڑی شخصیتیں، ایلیٹ کی۔ ییٹس کی اور میری پیدا کیں۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کا یہ دعوا غلط نہیں ہے۔ آڈن یقیناً اس صدی کے بڑے انگریزی شاعروں میں سے تھا۔

آڈن انگریز تھا، مگر تیس سال تک

امریکہ کا شہری رہا۔ کچھ عرصہ ہوا وہ انگلستان واپس آگیا تھا اور آدھا وقت انگلستان میں اور آدھا آسٹریا میں گزارتا تھا، جہاں اس کا حال میں چھیاسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

آڈن کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اشروڈ کے ساتھ مل کر اس نے ایف سکس کی چڑھائی THE ASCENT OF F6 کے نام سے ڈراما بھی لکھا تھا۔ اس کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی برابر لکھتا رہا۔ نیویارک ریویو آف بکس میں اس کے تبصرے اور اس کی نظمیں آخر تک شائع ہوتی رہیں۔ پاؤنڈ نے انگریزی شاعری کو روشن تصویروں اور مانوس براہ راست لہجے میں بات کرنا سکھایا، ایلیٹ نے دیومالا اور اس کے اسرار کی مدد سے بیسویں صدی کے پیچیدہ سماج کی الجھن بیان کی، آڈن نے ان دونوں کی بستیوں کو اپنے ہیرے کی طرح ترشے ہوئے فقروں اور اپنے مخصوص مزاح سے آباد کیا۔ اس صدی کی چوتھی دہائی میں وہ اپنے ہم عصروں کی طرح بائیں بازو کی سیاست سے متاثر ہوا اور اسپین بھی ہو آیا، جہاں سے واپسی پر اس کے خیالات بدل گئے۔ اس وقت تک اس کا خیال تھا کہ سائنس اور شاعری کے ذریعہ سے فرد اور سماج کو جانا جاسکتا ہے اور دونوں کی اصلاح ہوسکتی ہے وہ سمجھتا تھا کہ جب ایسا ہو جائے گا تو انصاف کا شہر" وجود میں آجائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ اس نے اپنی بعض نظموں مثلاً ستمبر کو رد بھی کردیا اور بعض دوسری نظموں میں تبدیلیاں کیں۔ اس زمانے کی بعض نظمیں بہت مشہور ہوئیں مثلاً فرائڈ، ییٹس اور اسپین پر اس کی نظمیں۔ فرائڈ پر نظم کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"ہمارے لئے وہ اب صرف ایک شخص نہیں ہے
بلکہ مسلمات کا ایک موسم ہے
جس کے تحت ہم اپنے الگ الگ جیون گزارتے ہیں۔
موسم کی طرح وہ صرف مدد کرسکتا ہے یا روک سکتا ہے
وہ گھمنڈی ہیں، وہ اب بھی گھمنڈ کرسکتے ہیں
مگر انھیں یہ ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

اصل نظم میں (CLIMATE OF OPINION) ہے، اس کا ترجمہ مجھے بہت مشکل معلوم ہوا، بہرحال کسی طرح مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس نظم کا ایک دوسرا ٹکڑا دیکھئے:۔

"وہ ہم سے بس اتنا ہی مطالبہ کرتا ہے۔
آزاد ہونے کے معنی اکثر تنہا رہنے کے ہیں"

اس نے شاعری کے متعلق ایک دفعہ کہا تھا "شاعر وہ تصویریں (امیج) جمع کرتا ہے جو تکلیف دیتی ہیں اور کنیکٹ (CONNECT) کرتی ہیں یعنی ملاتی ہیں کسی نے اسے الجھن کے اس دور کا سنت بھی کہا ہے۔ اس کے یہاں آخر تک توانا اور جاندار شاعری ملتی ہے۔ سیرل کانولی نے ۱۹۶۶ء میں کہا تھا کہ "ہم میں سے بہت سوں کے لئے آڈن وہ آخری شاعر ہے جو ہمیں زبانی یاد ہے۔ (IN PRAISE OF LIMESTONE) کو بعض نقادوں نے اس کی بہترین نظم کہا ہے اور اس کی (LAY YOUR SLEEPING HEAD MY LOVE) ایک نقاد کے نزدیک انگریزی کی بہترین لیرک (غنائی) نظموں میں سے ہے۔

آڈن میرا کوئی نہ تھا۔ مگر وہ بڑا شاعر تھا اس نے لاکھوں انگریزی شاعری کے دلدادہ اشخاص کو مسرت اور بصیرت کے لمحے دئے۔ میں اس کی عظیم روح کو سلام کرتا ہوں اور اس کا شکر گزار ہوں۔ وہ میرا ہیرو نہیں ہے اس کے سارے خیالات سے مجھے اتفاق نہیں ہے، مگر اس نے اس دور کے کرب اور اس کے سوز و ساز کو محسوس کیا ہے اور یہاں بھی اسے پیمبری ملی ہو یا نہیں مگر اس کے پاس آگ تو ہے۔

ڈاکٹر پرکاش مونس

میراں جی شمس العشاق کا

سال پیدائش وزمانہ وفات

شاہ میراں جی شمس العشاق کو دکنی ادب کی تاریخ میں ایک نشان منزل کی حیثیت حاصل ہے لیکن دنیا کے بعض معروف ادیبوں کی طرح بدنصیبی سے میراں جی کے حالات زندگی بھی پردۂ خفا میں ہیں، حتیٰ کہ ان کی تاریخ پیدائش اور زمانۂ وفات تک کا تعین قطعیت کے ساتھ نہیں ہو پاتا۔

میراں جی کے سال وفات کے بارے میں علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل میں تو عجیب بوالعجبی نظر آتی ہے۔ صفحہ ۲۰۹ پر لکھا ہے کہ آپ کی "تاریخ وفات ۹۰۲ ہجری / ۱۴۹۷ء عیسوی کہی جاتی ہے" پھر تذکرہ اولیائے دکن کے حوالے سے سن وفات ۹۸۰ ہجری / ۱۵۷۳ء بتا کر اس میں شبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ آگے چل کر روضۃ الاولیاء کے حوالے اور بساتین السلاطین کی تائید سے میراں جی کے علی عادل شاہ اوّل کے عہد حکومت میں بیجاپور تشریف لانے کا تذکرہ ہے۔ علی عادل شاہ اوّل کا دور حکومت ۹۶۵ ہجری تا ۹۸۸ ہجری یعنی ۱۵۵۸ تا ۱۵۸۰ عیسوی ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ میراں جی ۹۶۵ ہجری میں بقید حیات تھے۔ صفحہ ۲۱۰ پر ایک مرثیے کے چند اشعار درج ہیں جو میراں جی کی وفات پر لکھا گیا تھا اس سے تاریخ ۲۵ر شوال سنہ ۹۰۲ ہجری بمطابق ۲۶ر جون ۱۴۹۷ء معلوم ہوتی ہے لیکن مرثیے کے فوراً بعد یہ اضافہ موجود ہے "مگر ڈاکٹر زور نے اس کو غلط قرار دیا ہے" اور صرف چار سطروں کے بعد درج ہے "ڈاکٹر زور نے مختلف شواہد کی بنا پر میراں جی کا سنہ وفات ۹۰۲ھ / ۱۴۶۷ء بتایا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے" (ظاہر ہے ۱۴۶۷ء عیسوی طباعت کی غلطی ہے ورنہ ۱۴۹۷ عیسوی ہونا چاہئے)۔ اسی صفحہ کے فٹ نوٹ میں سخاوت مرزا صاحب کے ایک نسخے میں "درود میراں جی بدر بیجاپور رحمت

۹۶۷ ہجری" بتایا گیا ہے۔ اس طرح ایک سانس میں سنہ وفات ۹۰۲ ہجری بتایا جاتا ہے دوسرے میں ۹۸۰، تیسرے میں پھر پہلا سنہ دہرایا جاتا ہے، چوتھے میں ایک بار پھر اسے غلط قرار دیا جاتا ہے، پانچویں میں ۹۰۲ ہجری کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے لیکن چھٹے میں انھیں ۹۶۷ ہجری میں بقید حیات بتایا جاتا ہے غرض "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" والا معاملہ ہے۔

نصیر الدین ہاشمی صاحب نے ۹۰۲ ہجری کو ہی میراں جی کا صحیح سال وفات مانا ہے۔[1] فراق گورکھپوری نے بھی اپنی ہندی تصنیف "اردو بھاشا اور ساہتیہ" (مطبوعہ ۱۹۶۰ء ص ۳) میں میراں جی کا سال وفات ۱۴۹۰ء بتایا ہے جو ۹۰۲ ہجری کا متوازی سنہ عیسوی ہے۔ مولانا عبدالحق نے تحریر فرمایا ہے کہ "ان کا (میراں جی کا) سنہ وصال لفظ شمس العشاق سے ۹۰۲ ہجری / ۱۴۹۶ء نکلتا ہے"[2] خود علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں بھی ص ۲۱۰ پر لفظ شمس العشاق کو ان کا مادہ "تاریخ وفات" تسلیم کیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر شمس العشاق جو اتنا مشہور ہے کہ میراں جی کے نام کا جزو بن کے رہ گیا ان کا مادہ تاریخ وفات ہے تو پھر مختلف محققین میں آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اس قدر شدید اختلافات کیوں ہیں؟ اس کے علاوہ یہ امر بھی حیرت انگیز ہے کہ کسی شخص کا مادہ تاریخ وفات اس کے نام کے لاحقے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ شمس العشاق مادہ تاریخ وفات نہ ہو بلکہ یہ میراں جی کا تاریخی نام ہو جو یا تو ان کی پیدائش کے وقت نکالا گیا ہو یا بعد میں جب آپ کی بزرگی کا شہرہ ہوا ہو تو کسی نے یہ تاریخی نام نکال کر آپ کے نام کے ساتھ منسلک کر دیا ہو اور آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے ہوں ورنہ مادۂ تاریخ وفات کا نام کے ساتھ جوڑا جانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

[1] دکن میں اردو ۱۹۶۶ء ص ۵۰

[2] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۳

ہمارا یہ شبہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے بلکہ اس کی معقول وجوہ موجود ہیں۔ ایک ہندی محقق پروفیسر دشر تھ راج اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں "شاہ میراں جی سنہ ۹۰۲ ہجری (۱۴۹۶ عیسوی) میں مکہ میں پیدا ہوئے"[1] دکنی ادب کی تاریخ کے صفحہ بائیس پر ڈاکٹر زور نے بھی ۱۴۹۶ عیسوی کو میراں جی کا سال وفات نہیں بلکہ سال پیدائش بتایا ہے۔[2]

میراں جی کے بیٹے برہان الدین جانم کی وفات علی گڑھ تاریخ ادب اردو (ص ۲۱۰) کے مطابق ۹۹۰ ہجری / ۱۵۸۲ عیسوی کے بعد ہوئی جبکہ ڈاکٹر زور ان کا سال وفات صراحتاً ۱۵۹۰ء بتاتے ہیں۔[3]

یہ سب کو معلوم ہے کہ جانم نے میراں جی سے خلافت پائی اگر خلافت کے وقت جانم کی عمر بیس سال ہی فرض کر لی جائے اور میراں جی کا سنہ وفات ۹۰۲ ہجری / ۹۷-۱۴۹۶ عیسوی مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جانم ۹۷-۱۴۹۶ء میں بیس سال کے تھے۔ اس حساب سے ۱۵۹۰ء میں وفات کے وقت ان کی عمر عیسوی سنہ کے حساب سے ایک سو تیرہ سال اور ہجری سنہ کے حساب سے ۱۱۷ سال کی ہوگی۔ ہر چند اتنی عمر پانا ناممکن نہیں ہے لیکن چونکہ یہ خاصی غیر معمولی بات تھی اس کا کہیں نہ کہیں ذکر ضرور ہوتا۔

لیکن غریب جانم نے تو صرف ۴۷ سال کی مختصر عمر پائی کیونکہ ان کا سال پیدائش ۱۵۴۳ء ہے (دکنی ادب کی تاریخ ۱۹۵۹ء۔ ص ۳۱) اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۹۷-۱۴۹۶ء ان کے والد کا سنہ وفات نہیں بلکہ سال پیدائش ہے اور لفظ شمس العشاق ان کا مادہ تاریخ وفات نہیں بلکہ تاریخی نام ہے۔ ان کے سال وفات کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کے بیٹے جانم کے بارے میں لکھا ہے کہ "انھوں نے ظاہری اور باطنی علوم کی تکمیل اپنے والد ہی کے ذریعہ کی" اگر ان علوم کی تکمیل جانم نے ۲۵ سال کی قلیل عمر میں بھی کر لی ہو تو بھی شاہ میراں جی ۱۵۶۸ عیسوی کے قریب بقید حیات ٹھہرتے ہیں جس کی تائید تذکرۃ الاولیائے دکن اور بساتین السلاطین کے محولہ بالا بیان اور سخاوت مرزا صاحب کے نسخہ کے اندراج "وردو میراں جی در بیجاپور رحلت ۹۶۷ ہجری / ۱۵۶۰-۱۵۵۹ عیسوی" سے بھی ہوتی ہے۔ ان کی وفات ۱۵۶۸ء کے بعد ہی کسی سال میں ہوئی ہوگی۔

۱؎ سملین پتر کا جلد ۴۹ شمارہ ۲ ستمبر ۱۸۸۵ء ص ۸

۲؎ دکنی ادب کی تاریخ ص ۲۱

۳؎ علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۲۱

(صفحہ ۵ سے آگے)

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے ارباب حل وعقد اکثر مترجموں کو بھلا دیتے ہیں، جو کہ صرف ایک زبان کی نہیں بلکہ دو زبانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ان اداروں سے بھی شکایت ہے جو اچھی تصانیف پر انعامات عطا کرتے ہیں ان اداروں کو چاہئے کہ اچھے ترجمے پر بھی مترجم کو انعامات کا مستحق سمجھیں۔

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اتنے بڑے ملک میں جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اچھے ترجمے ہی ایک دوسرے کو قریب لا سکتے ہیں۔ جب تک ایک لسانی گروپ دوسرے لسانی گروپ کے احساسات وجذبات کو نہیں سمجھ سکے گا اس وقت تک اجنبیت کا احساس باقی رہے گا۔ اجنبیت کی اس آہنی دیوار کو صرف ترجموں ہی کے ذریعے منہدم کیا جا سکے گا۔

اس ضمن میں جناب نقوی صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ انجمن ترقی اردو کی دلی کانفرنس میں اس مسئلے کو اٹھائیں۔ اور انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مترجموں کے لئے ایک آل انڈیا فورم کی تشکیل دیں جس کی رکنیت ہندوستان کی تمام زبانوں کے مترجموں کے لئے عام ہو۔ یہ فورم "وقتاً فوقتاً" مترجموں کے مسائل پر غور کرے گا۔

دنیا کے ہر بڑے ملک میں ایسے فورم موجود ہیں ہندوستان کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے۔ امید ہے کہ نقوی صاحب اور دیگر مترجمین میرے ان مشوروں پر غور کریں گے اور اپنے اپنے خیالات سے "ہماری زبان" کے ذریعہ مستفید فرمائیں گے۔

ترجاپلی۔ • حسرت سہروردی

مراسلات

ایک خط جو پورا نہ ہو سکا

اترپردیش کی ریاستی انجمن ترقی اردو کے صدر پنڈت کشن پرشاد کول انجمن کے جلسے میں شرکت کے ارادے سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک دو دن کے لئے اپنی صاحبزادی کے پاس آگرے میں ٹھہر گئے اور وہیں انتقال کر گئے۔ انجمن کے جلسے میں شریک نہ ہو سکے میں جلسے میں شرکت کرنے کے بعد علی گڑھ سے واپس آکر ۱۳ر جنوری ۱۹۵۵ء کو کول صاحب کو خط لکھ رہا تھا لیکن ابھی خط پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ ادھورا خط ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

خط میں صلح کا جو ذکر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انجمن کے سکریٹری قاضی عبد الغفار مرحوم سے لکھنؤ کے تینوں ممبروں یعنی پنڈت کول، حیات اللہ انصاری اور راقم حروف کو بعض معاملات میں شدید اختلاف تھا جو جلسے کے دوران میں بعض اوقات جنگ کی سی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس جلسے میں بھی یہی صورت پیش آنے والی تھی۔

مذکورۂ بالا خط کی نقل

مخلص نواز تسلیم

آپ کو خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے کی زحمت دینے کو تو اب بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر کیا کروں کتنی مدت ہو گئی کہ نہ زیارت کی مسرت حاصل ہوئی نہ ہم کلامی کا شرف۔ آج کسی طرح دل نہ مانا اور میں قلم کی زبان سے دو باتیں کرنے بیٹھ گیا۔ میں انجمن کے جلسے میں شرکت کرنے کی غرض سے ایک دن پہلے ہی علی گڑھ پہنچ گیا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھا اولڈ بوائز لاج پہنچا۔ ایک ایک سے آپ کی تشریف آوری کی خبر دریافت کرتا پھرا اور آخرکار مایوس ہو کر اپنی قیام گاہ یعنی ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کے مکان پر چلا گیا۔ دوسرے دن صبح کو حیات اللہ صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ میرے پاس آئے تو یہ تکلیف دہ خبر ملی کہ آپ نے ان سے یہ اطلاع دے دی ہے کہ بیماری کے باعث آپ جلسے میں شرکت نہ کر سکیں گے۔ ایک طرف اس خبر نے افسردہ کر دیا، دوسری طرف ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے صلح پر اصرار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلسے میں شرکت تو ہوئی مگر بے لطفی اور خاموشی کے ساتھ۔ تیرہ جنوری کو مقامی شاخوں کے نمائندوں کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ توقع کے خلاف باہر سے اچھی تعداد میں لوگ آ گئے۔ ریاستی شاخ قائم ہو گئی۔ عہدے دار آپ کی مرضی کے موافق منتخب ہو گئے۔ مگر آپ کی عدم موجودگی کے احساس سے میرا دل افسردہ ہی رہا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں مجلسی مصروفیتوں سے بالکل الگ رہتا ہوں۔ انجمن کے جلسوں میں میری شرکت آپ کے اصرار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سنا تھا کہ ریاستی شاخ کی صدارت کے لئے الہ آباد کے نمائندے کسی اور کا نام تجویز کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے بے تامل فیصلہ کر لیا اور اس کا اظہار بھی کر دیا کہ اس صورت میں مجھے انجمن سے کنارہ کش سمجھ لیا جائے۔ غنیمت ہوا کہ اس کی نوبت نہیں آئی اور صدارت کے لئے صرف آپ کا نام پیش ہو کر بہ اتفاق منظور ہو گیا۔

یہ خط یہیں تک لکھا تھا کہ کول صاحب کے انتقال کی خبر ملی اور میں نے یہ الفاظ لکھ کر قلم روک لیا۔

"افسوس اردو کی جنگ کا یہ سالار اٹھ گیا۔ ان کی جگہ لینے والا اب کوئی نظر نہیں آتا۔"

(دستخط) سید مسعود حسن رضوی

اردو مترجموں کی تنظیم کی ضرورت

ہماری زبان مورخہ ۲۲ر ستمبر میں جناب سید محمود نقوی صاحب کا مراسلہ "اردو مترجموں کی تنظیم کی ضرورت" نظر نواز ہوا۔ موصوف نے ایک اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ مترجموں کی تنظیم وقت کی ایک اہم ضرورت ہے جس کو اب تک نظر انداز کیا گیا۔ ایک مترجم کی حیثیت سے

(باقی صفحہ ۷ کالم ۲ پر)

اخبار کے تراشے

اردو دوستوں کی ذمہ داری

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی صدر جناب بیگم حامدہ حبیب اللہ اور اکاڈمی کے سکریٹری جناب سراج الدین عمر نے الگ الگ [illegible] صحافتی بیانوں میں اردو دوستوں سے اپیل کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردو پڑھنے والے طلبہ کو اسکولوں میں داخل کرانے کی مہم میں حصہ لے کر اردو تحریک کو کامیاب بنانے کی جد و جہد کریں۔ اردو دوستوں کی معلومات اور توجہ کے لئے ہم ذیل میں اس اخباری بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ ادارہ

(۱) اتر پردیش کے تمام میونسپل حلقوں کے پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لئے ایک ٹیچر کا تقرر کر دیا گیا ہے۔

(۲) بیسک پریشد کے جونیر ہائی اسکولوں میں اردو کی تعلیم دینے کے لئے ایک ہزار ٹیچروں کا تقرر ہو رہا ہے

(۳) پہاڑی ضلعوں کو چھوڑ کر ۴۴ اضلاع کے گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکولوں میں اردو ٹیچروں کا تقرر پہلے ہو چکا تھا اور اب باقی ایک سو اسی (۱۸۰) گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی اردو ٹیچر مقرر کرنے کے احکام جاری کر دئے گئے ہیں۔

(۴) جو ڈگری کالج اپنے یہاں اردو پڑھانے کے سکشن کھولیں گے انھیں اردو لکچرر مقرر کرنے کے لئے پہلے ہی سال سے مالی امداد دی جائے گی۔

حکومت کے ان احکام کے بعد تمام اردو دوستوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے ان کو چاہئے کہ پرائمری درجوں سے لے کر اوپر کے درجات تک زیادہ سے زیادہ تعداد میں طالب علموں کو اردو پڑھنے پر آمادہ کریں اور اُن کا اردو کے درجوں میں داخلہ کرائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طالب علموں کے والدین اور سرپرستوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو درجات میں داخل کرائیں اور جو بچے اس وقت اردو نہیں پڑھ رہے ہیں وہ بھی اردو کے درجات میں نام لکھا لیں یہ وقت کی پکار ہے اور اس پکار پر آگے بڑھنا اردو دوستوں کا فرض ہے۔ بیسک پریشد کے جونیر ہائی اسکولوں کے درجہ چھ میں کم سے کم پانچ طالب علم تو اردو کے ہونا ہی چاہئیں اگر اردو کی تعلیم دینے والے اساتذہ کی تقرری کے بعد بھی پرائمری اور دوسرے درجات میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم یا بالکل نہیں رہتی تو اس سے اردو کے مفاد کو بڑا زبردست نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ وقت اس کا متقاضی ہے کہ میونسپلٹیوں کے حدود میں ۱۰ فی پرائمری اسکول جہاں اردو پڑھانے کے لئے ٹیچروں کا تقرر ہو گیا ہے نیز دوسرے اسکول اور کالج جہاں اردو پڑھانے کا انتظام ہے بے کیس کے مکان نہ بننے پائیں اور یہ نہ کہا جا سکے کہ اردو کی تعلیم کا انتظام ہو جانے کے بعد بھی اردو پڑھنے کا کوئی خواہش مند نہیں ہے

صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہم سب کا فرض ہے کہ بچوں کے والدین اور بچوں دونوں کو ہم اس کا احساس دلائیں کہ اردو کے درجوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخلے لئے جائیں۔ اردو دوستوں سے میری یہ درخواست ہے کہ اردو پڑھنے کی تحریک کو عام بنا دینے میں بیش از بیش کوشش فرمائیں۔

یہ بھی درخواست کی جاتی ہے کہ اگر کسی اسکول میں کسی وجہ سے کچھ بچوں نے اردو میں داخلہ نہیں لیا ہے تو انھیں اور والدین کو اس بات پر بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ اب اردو کے درجے میں اپنا داخلہ لے لیں اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو اپنے فیصلہ کی تحریری صورت میں اطلاع دے دیں۔

• حامدہ حبیب اللہ و سراج الدین عمر

• قومی آواز، لکھنؤ

لسانی منافرت پھیلانے والوں کو تنبیہ

دلی اردو کے سرکردہ ہندو سکھ اور مسلم ادیبوں کی ایک میٹنگ نامور شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی زیر صدارت دفتر ملاپ میں منعقد ہوئی جس میں متعدد ایڈیٹر، شاعر، مصنف، اخبار نویس اور مضمون نگار شامل ہوئے۔ میٹنگ کے بعد حسب ذیل

مشترکہ بیان جاری کیا گیا۔

اردو سے ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے لئے یہ امر باعث اطمینان ہے کہ اترپردیش میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے کچھ قدم اٹھائے گئے ہیں لیکن یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ فرقہ پرست برافروختہ ہوگئے ہیں اور انھوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر اترپردیش میں اردو کو یہ مراعات منسوخ نہ کی گئیں تو اردو کے خلاف ایک تحریک شروع ہو جائے گی یہ دھمکی ہر لحاظ سے قابل مذمت ہے کیونکہ اردو ہندوستان کی اپنی زبان ہے ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستان میں پروان چڑھی۔ اردو نے ملک کی آزادی اور انقلاب کی جدوجہد میں نمایاں پارٹ ادا کیا۔ اردو ملک کے آئین کے تحت ان چودہ زبانوں میں سے ایک ہے جنھیں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے سارے حقوق حاصل ہیں۔ اردو کا ملک کی قومی زبان ہندی سے کوئی جھگڑا نہیں اس لئے اردو کے خلاف کوئی بھی تحریک چلانا لسانی منافرت پھیلانا، فرقہ وارانہ کشیدگی کی آگ بھڑکانا اور ملک کی ڈیموکریسی کی فضا کو مکدر کرنا ہے۔ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اسے ہمارے ملک کے ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں، پارسیوں اور عیسائیوں کی زبان ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اردو پر تمام فرقوں کا حق ہے اس لئے ہم اردو دشمن خود ساختہ لیڈروں کو انتباہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی مصلحتوں کے پیش نظر اردو کی مخالفت کی آڑ میں تنگ نظری اور منافرت کا پروپگنڈہ نہ کریں۔

• دعوت - دہلی

اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی حمایت

بریلی۔ یہاں بھارتی سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری جناب مدھو متھنے نے نامہ نگار الجمعیۃ سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ان کی پارٹی اور ۱۵۰ اردو کو دیتی ہیں۔ اور اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی حمایت کرتے ہیں۔

• الجمعیۃ، دہلی

غالب جرمنی میں

غالب کے اردو فارسی کلام کا جرمن زبان میں ایک ترجمہ حال ہی میں میونخ سے شائع ہوا ہے یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اپنی اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر اندر فروخت ہوگئی۔

اس کی مترجم اردو فارسی کی مشہور نامور ادیبہ مس انی میری شمل ہیں موصوفہ نے ہندوستان و پاکستان میں کئی سال قیام کرکے اس سلسلے میں تحقیق و جستجو کی ہے انھوں نے ایک کتاب اقبال پر بھی جرمن زبان میں لکھی ہے۔

• جرمن نیوز

اردو ایک عالمگیر زبان

حیدرآباد۔ لندن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو سے وابستہ ڈاکٹر میتھوس نے شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ میں طلبائے ایم اے کی جانب سے منعقدہ خیرمقدمی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک عالمگیر زبان ہے اردو شاعری سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ڈاکٹر میتھوس نے جو دکنی ادب پر ریسرچ کے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں بتایا کہ انھوں نے عبادت بریلوی سے اردو زبان سیکھی قدیم شعراء میں میر اور غالب، اور جدید ترقی پسند شعراء میں فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔

• رہنمائے دکن۔

دوسرے اداروں کی خبریں

اردو کے طالب علموں کے لئے یو۔پی۔ اردو اکادمی کے وظائف کی تفصیلات

لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی نے اترپردیش کے کسی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے نویں، گیارہویں، بی۔اے (سال اوّل)، ایم۔اے (سال اوّل) اور پی۔ایچ ڈی درجات میں اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے باقاعدہ (REGULAR) طلبہ/طالبات کو ایک محدود تعداد میں وظائف دینے کا فیصلہ کیا ہے درخواستیں اترپردیش اردو اکادمی کے مقررہ فارم پر ہی قبول کی جائیں گی۔ یہ فارم اکادمی کے دفتر (۱۳-اے، ماڈل ہاؤس، لکھنؤ) سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ وظائف کے سلسلے میں اردو اکادمی کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی خط و کتابت نہ کی جائے گی۔ مقررہ فارم پر درخواستیں اس طرح بھیجی جائیں کہ سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی کو زیادہ سے زیادہ ۳۰ر اکتوبر ۰۳ء تک پہنچ جائیں۔ وظائف کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

ہائی اسکول اسکالرشپ:

نویں درجے کے طالب علموں کو دئے جانے والے وظیفے یعنی "ہائی اسکول اسکالرشپ" کے دس طالبات اور طلبہ مستحق ہوں گے جنھوں نے درجہ نہم میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو لی ہو اور جو بعد ہائی اسکول کا امتحان (یا ہائر سکنڈری اسکولوں کے درجہ ہشتم کا امتحان) کم از کم ۶۰ فی صد نمبروں کے ساتھ پاس کیا ہو۔ وظیفہ ہائی اسکول سال اول (درجہ نہم) کے لئے دیا جائے گا۔ قابل اطمینان ترقی کی صورت میں ہائی اسکول سال دوم (درجہ دہم) کے لئے اس کی تجدید کی جاسکتی ہے۔ وظیفے کی رقم دس روپے ماہانہ ہے اور اسکالرشپ کی تعداد پچاس ہے۔ اس رقم اور اس کی تعداد میں کسی وقت بھی ترمیم کی جاسکتی ہے۔ کسی ضلع میں ایک سے زیادہ وظیفہ نہیں دیا جائے گا درخواستیں اسکول/کالج کے پرنسپل کی تصدیق کے ساتھ بھیجی جائیں ورنہ ان پر غور نہ کیا جائے گا۔ وظیفے کے لئے وہی امیدوار منتخب کئے جائیں گے جنھوں نے اردو میں باقی امیدواروں سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہوں۔

انٹرمیڈیٹ اسکالرشپ:

انٹرمیڈیٹ اسکالرشپ کے مستحق صرف وہ طالبات/طلبہ ہوں گے جو انٹرمیڈیٹ (یا پری یونیورسٹی کورس) کے باقاعدہ طالب علم ہوں، جنھوں نے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو لی ہو اور جنھوں نے اردو کے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہو۔ وظیفہ انٹرمیڈیٹ (سال اول) کے لئے دیا جائے گا اور قابل اطمینان ترقی کی صورت میں اس کی تجدید انٹرمیڈیٹ (سال دوم) کے لئے کی جاسکتی ہے۔ کسی ضلع میں ایک سے زیادہ امیدوار کو وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ انٹرمیڈیٹ اسکالرشپ کی تعداد پچاس اور وظیفے کی رقم بیس روپے ماہانہ ہے۔ اس رقم اور وظائف کی تعداد میں کسی وقت بھی ترمیم کی جاسکتی ہے وظیفے کے لئے وہی امیدوار منتخب کئے جائیں گے جنھوں نے اردو میں باقی امیدواروں سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہوں۔

انڈر گریجویٹ اسکالرشپ:

انڈر گریجویٹ اسکالرشپ کے مستحق وہی طالبات اور طلبہ ہوں گے جو اترپردیش میں واقع کسی یونیورسٹی یا کالج میں بی۔اے کے باقاعدہ طالب علم ہوں اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو لے رکھی ہو۔ اسی کے ساتھ انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کم از کم سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہو۔ وظیفہ بی۔اے (سال اول) کے لئے دیا جائے گا اور قابل اطمینان ترقی کی صورت میں اس کی تجدید بی۔اے (سال دوم) اور سہ سالہ ڈگری کورس کی صورت میں بی۔اے (سال سوم) کے لئے کی جاسکتی ہے۔ انڈر گریجویٹ اسکالرشپ کی تعداد بیس ہے اور وظیفے کی رقم تیس روپے ماہانہ ہے۔ وظیفے کی رقم اور اس کی تعداد میں کسی وقت میں

ترمیم کی جاسکتی ہے۔ درخواستیں، یونیورسٹی کے ڈین فیکلٹی آف آرٹس (کالجوں کی صورت میں پرنسپل) کی تصدیق کے ساتھ بھیجی جائیں ورنہ اُن پر غور نہ کیا جائے گا۔ کسی تعلیمی ادارے کے ایک سے زیادہ طالب علم کو وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ وظیفے کے لئے وہی امیدوار منتخب کئے جائیں گے جنھوں نے اردو میں باقی امیدواروں سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہوں۔

پوسٹ گریجویٹ اسکالرشپ:

پوسٹ گریجویٹ اسکالرشپ کے مستحق صرف وہ طالبات/طلبہ ہوں گے جو اترپردیش میں واقع کسی یونیورسٹی یا پوسٹ گریجویٹ کالج میں ایم۔اے (اردو) کے باقاعدہ طالب علم ہوں جنھوں نے بی۔اے کا امتحان کم سے کم سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہو اور اردو میں کم از کم ۵۵ فیصد نمبر حاصل کئے ہوں اور جنھیں کسی اور ذریعے سے کوئی وظیفہ نہ مل رہا ہو۔ درخواستیں یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو (پوسٹ گریجویٹ کالجوں کی صورت میں پرنسپل) کی تصدیق کے ساتھ بھیجی جائیں ورنہ ان پر غور نہ کیا جائے گا۔ وظیفہ ایم۔اے کے پہلے سال کے لئے دیا جائے گا اور تا حصول اطمینان ترقی کی صورت میں اس کی تجدید ایم۔اے کے دوسرے سال کے لئے کی جاسکتی ہے۔ کسی تعلیمی ادارے کے ایک سے زیادہ ایم۔اے کے طالب علم کو وظیفہ نہیں دیا جائے گا اور یہ وظیفہ بھی اس شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ اگر طالب علم نے کوئی اور وظیفہ قبول کیا تو اردو اکاڈمی کے وظیفے کی موصولہ رقم اکاڈمی کو واپس کردی جائے گی۔ وظائف برائے ایم۔اے کی تعداد دس ہے۔ ان میں سے پانچ وظیفے اقامتی یونیورسٹیوں (بنارس، علی گڑھ، لکھنؤ، الٰہ آباد، گورکھپور) کے لئے اور باقی پوسٹ گریجویٹ کالجوں کے لئے ہیں۔ وظیفے کی رقم پچاس روپے ماہانہ ہے۔ وظیفے کی رقم اور تعداد میں کسی وقت بھی ترمیم کی جاسکتی ہے۔

ریسرچ اسکالرشپ:

ریسرچ اسکالرشپ کے مستحق صرف وہ طالبات/طلبہ ہوں گے جو اترپردیش میں واقع کسی یونیورسٹی میں باقاعدہ اردو کے ریسرچ اسکالر ہوں، جنھوں نے ایم۔اے (اردو) کے امتحان میں کم از کم ۵۵ فی صد نمبر حاصل کئے ہوں اور جنھیں کسی اور ذریعے سے وظیفہ نہ مل رہا ہو۔ درخواستیں یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو (پوسٹ گریجویٹ کالج کی صورت میں پرنسپل) کی تصدیق کے ساتھ بھیجی جائیں، ورنہ اُن پر غور نہ کیا جائے گا۔ وظیفہ ایک سال کے لئے دیا جائے گا۔ دوسرے سال اس کی تجدید کی جاسکتی ہے لیکن کسی صورت میں وہ دو سال سے زیادہ کی مدت کے لئے نہیں دیا جائے گا۔ وظیفہ اس شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ اگر ریسرچ اسکالر نے کوئی اور وظیفہ قبول کیا تو اردو اکاڈمی کے وظیفے کی موصولہ رقم اکاڈمی کو واپس کردی جائے گی۔ کسی یونیورسٹی میں دو سے زیادہ وظیفے نہیں دئے جائیں گے۔ تحقیقی مقالے کی اشاعت کی صورت میں مصنف کو یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ اُسے دوران تحقیق اردو اکاڈمی کی مالی امداد حاصل رہی ہے۔ وظیفہ پانے والے کو اپنے تحقیقی مقالے کی رفتار ترقی کی رپورٹ جس پر صدر شعبہ کی تصدیق ہو سہ ماہی بھیجتے اکاڈمی کو پیش کرنا ہوگی۔ اگر کام کی رفتار تسلی بخش نہ ہوئی تو وظیفہ بند کیا جاسکتا ہے۔ ریسرچ کے لئے دس وظائف دئے جائیں گے جن میں سے ایک وظیفہ پوسٹ گریجویٹ کالجوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ وظیفے کی رقم ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ہوگی۔ وظائف کی تعداد اور رقم میں کسی وقت بھی ترمیم کی جاسکتی ہے۔

• سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی

قومی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے زندہ دلی لازمی

حیدرآباد: جناب اندرکمار گجرال مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات نے ممتاز انشائیہ نگار جناب نریندر لوتھر کی کتاب "مزاج پرسی" کا اجرا کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ جو قومیں زندہ دل نہیں ہوتیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ قوموں کی زندگی میں زندہ دلی جس قدر زیادہ ہوتی ہے ان کی زندگی اتنی ہی خوشگوار ہوا کرتی ہے۔ جناب گجرال نے کہا کہ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہماری زبانوں میں طنز و مزاح کی کمی ہے کیونکہ ہماری زندگی میں بھی اس کی کمی ہے۔ طنز و مزاح کا سلسلہ پطرس سے شروع ہوکر فکر تونسوی پر ختم سمجھا جاتا تھا لیکن اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ حیدرآباد میں طنز و مزاح کے لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ طنز و مزاح دل کی گہرائیوں میں اترنے اور اصلیت کو پانے کے لئے فن کا کام ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ پر ہنسنا بہت بڑی بات ہے، اچھا جو آپ پہ ہنسنا نہیں جانتا وہ دوسروں کو بھی متاثر نہیں کرسکتا۔ • نامہ نگار

(صفحہ ۱۱ سے آگے)

پر نظریاتی شدت ان کے پچھلے متوازن ادبی رویّے کو دیکھتے ہوئے حیرت ناک تھی لیکن اگر ہم ان تجربات کو ہمدردی سے دیکھیں جن سے گزر کر وہ ہندوستان واپس آئے تھے تو ان کے خلوص اور ترقی پسندی سے استوار وفاداری کو ذرا سا انحراف اور ہلکی سی تنقید بھی خطرے کی گھنٹی محسوس ہونے لگی۔ شخصی سطح پر وہ قید و بند کی سختیوں میں بھی دل برداشتہ اور تلخ نہیں ہوئے۔ جیل سے لکھے ہوئے ان کے خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ اگر کہیں کسی ذاتی مسئلے کی طرف اشارہ بھی ہے تو گزراں اور سرسری۔ گویا سر پر موت کی تلوار نہیں لٹک رہی ہو، بلکہ گل گشتِ شوق کی راہ میں کہیں کوئی ہلکی سی رکاوٹ آگئی ہو۔ ان خطوں میں بیشتر ادبی مسائل، کتابوں، شعرا کے دواوین، افسانوں، لطیفوں اور فیض کی شاعری کے چرچے ہیں۔ فیض کی "زنداں نامہ" کی بہت سی غزلیں انہی خطوط کے وسیلے سے سوغات کی طرح اہلِ ذوق تک پہنچیں۔ موت کے سایے میں یہ غیر شخصی انداز اور اسے نظر انداز کرنے کا یہ رویّہ ان کی حوصلہ مندی، یقین اور نظریے سے وابستگی کے مستحکم شواہد ہیں۔ انھیں ہندوستان میں بنتی ہوئی نئی ادبی فضا میں چلنے والی تازہ ہواؤں اور لہروں کا صحیح علم نہ تھا۔ وہ شخصی طور پر بیشتر نئے لکھنے والوں اور ان کے نقادِ نظر سے ناآشنا تھے۔ وہ آزادی اور تقسیم سے قبل ہی پاکستان چلے گئے تھے اور برسوں روپوشی کی زندگی گزار چکے تھے اس لیے ان کا رشتہ نئے ادیبوں اور شاعروں سے ذاتی سطح پر منقطع ہو گیا تھا۔ جن خطرے کو وہ پاکستان میں خوش مزاجی سے جھیل آئے تھے، اسی خطرے کی بو انھیں ہندوستان میں محسوس ہو رہی تھی حالانکہ واقعہ ایسا نہ تھا۔ اسی دور میں انھوں نے میرے خلاف مضمون لکھا۔ اسی بحث کے دوران وہ ایک دو بار حیدرآباد بھی آئے۔ ایک دفعہ ایک ادبی نشست میں جو ان کو سننے، کہنے و ان سے ملانے کے لیے ہوئی، تھی میرا ان کا سامنا ہوا۔ وہ سراپا توجہ تھے اور میں ان سے گریزپا۔ اسی توجہ و گریز کی کشمکش میں کئی برس گزر گئے۔ ۱۹۶۵ء میں سلیمان اریب کے ساتھ دلی میں سجاد ظہیر کے گھر پر ان سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ آصف علی روڈ پر کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر کے ایک کمرے میں تنہا رہتے تھے۔ بے تکلف اور طویل نشست رہی۔ میں نے چند نظموں کے ساتھ ایک نظم "سنگسار" سنائی جو ۵۸ء کے ادبی ہنگامے ہی کی یادگار تھی۔ اس نظم کو سجاد ظہیر نے پانچ چھ بار سنا اور داد ایسی دی جیسی پہلے کبھی کسی نظم پر مجھے کسی نے نہ دی ہوگی۔ اسی وقت پرانے اختلاف پر کھل کر بات ہوئی اور سجاد ظہیر گزراں تلخیوں کو غلط فہمیوں کا نتیجہ قرار دے کر افسوس کرتے رہے خوش دلی، جان گوئی اور شعر و سخن کی اس فضا نے دلوں کے غبار دھو ڈالے۔ شخصی سطح پر ہم ایک دوسرے سے قریب آگئے اور وہ سجاد ظہیر سے بنے بھائی بن گئے۔

اس ملاقات کے بعد بار ہا بنے بھائی سے ملنے اور بعض ادبی اور اختلافی مسائل پر کھل کر بات کرنے کا موقع ملا لیکن کبھی کوئی بدگمانی پیدا نہ ہوئی۔ جب میرا پہلا شعری مجموعہ "پتھروں کا مغنی" شائع ہوا تو "حیات" ہفتہ وار میں سجاد ظہیر نے خود تفصیلی تبصرہ نما مضمون لکھا اور میری شاعری کو حقیقی معنوں میں انقلاب و بغاوت کا پیغام قرار دیا۔ وہ میری طویل نظم "شہر ہوس" کے کچھ حصے "گفتگو" میں پڑھ چکے تھے۔ اگرچہ وہ نظم مجموعے میں شامل نہ تھی مگر خصوصیت سے اس کا ذکر کیا ادبی حلقے اسے ان کی تنگ نظری و ادعائیت یا بیداد کہ انھیں اس نظم میں بڑی شاعری کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے جدیدیت کے بعض میلانات کو بھی سراہا اور ان کا خیر مقدم کیا۔ اس مضمون کے بعد بھی انھوں نے جدیدیت اور جدید ادبی تخلیقات پر کچھ مضامین لکھے۔ اب وہ جدیدیت کے انحراف کو بھی قبول کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے اور اسے ترقی پسندی کی ضد نہیں سمجھتے تھے۔ شخصی طور پر وہ جدید ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کرتے اور خلوص سے ملتے تھے۔ مارکسزم اور ترقی پسند تحریک سے ان کی راسخ استواری، نظریاتی شدت کے باوجود، ادب اور زبان، فن اور کلچر کی محبت میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ درمیان کے چند برسوں کو چھوڑ کر جب انھوں نے انتہا پسندانہ رویّہ اختیار کیا تھا وہ ہمیشہ توازن، روایت کے احترام اور تجربوں کی اہمیت کے مؤید رہے۔ "ایک غلط رجحان" کے عنوان سے "شاہراہ" میں انھوں نے بعض ترقی پسند انتہا پسندوں کو قدیم ادب کی بے سوچی سمجھی تنقید پر متنبہ کیا اور کلاسیکی تہذیب و فنون کی عظمت پر روشنی ڈالی تھی۔ اسی طرح ظ۔ انصاری کی تنقید حافظ کے جواب میں انھوں نے "ذکرِ حافظ" لکھ کر حافظ کا دفاع بھی کیا اور حافظ کے تصوف کی انقلابی روح کو بھی اجاگر کیا۔ اسی کتاب میں تصوف پر ان کی گہری نظر اور متصوفانہ نظریات سے ان کی عارفانہ باخبری پہلی بار سامنے آئی۔

(باقی آئندہ)

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

میں بہت سے اختلافات دیکھتا ہے جو کبھی کبھی تضاد و تنازعہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نئی نسل کا عموماً اور میرا خصوصاً ان دونوں محبوب شخصیتوں کے ساتھ یہی معاملہ رہا۔ مخدوم سے میری بحثیں حیدرآباد کے ادبی جلسوں اور کانفرنسوں سے لے کر دوستوں کی بے تکلف اور مخصوص محفلوں تک ہر موقع پر ہوتیں لیکن وقتی تلخی کے بعد ان کا اثر کبھی بھی دیر پا نہیں رہا۔ مخدوم کا ساتھ یوں بھی زیادہ رہا، قربت بھی زیادہ میسر آئی، لڑائیاں بھی زیادہ ہوئیں اور اسی لئے ان سے شخصی تعلق بھی زیادہ مستحکم رہا۔ یہ ان کی شخصیت کا طلسم تھا جو ہر اختلاف کو دوسرے دن ہنسی میں اڑا دیتا اور دوری کی خلیج کو پاٹ کر اختلاف کرنے والے کو ذاتی سطح پر کچھ اور بھی قریب لے آتا تھا۔ سجاد ظہیر کی شخصیت میں بھی یہ جادو تھی مگر ان سے ملنے، بحث کرنے، لڑنے اور انھیں جذبات و احساسات کی سطح پر سمجھنے کے مواقع کم ملے۔ اسی لئے جب ایک بار ان سے میرا جھگڑا ادبی رسائل کے صفحات پر ٹھن گیا تو اس کی تلخی بہت دن باقی رہی، یہ تلخی میرے اور ان کے درمیان شخصی اختلاف کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ادیبوں کی دو نسلوں کے رویے اور بدلے ہوئے حالات کو دیکھنے کے فرق کا نتیجہ تھی۔ اسی لئے جب ذاتی طور پر ملنے اور قریب آنے کا موقع آیا تو باوجود نظریاتی اور ادبی اختلافات کے تلخی کی جگہ خلوص اور ایک طرح کے جذباتی تعلق نے لے لی۔

جولائی، اگست ۵۶ء کے "صبا" میں معمول کے مطابق میں نے اپنا مستقل فیچر "سخن گسترانہ بات" لکھا جس میں نئے ادب کے مزاج اور ترقی پسند تحریک کی ادعائیت اور میکانکیت کے اختلاف پر روشنی ڈالی تھی۔ سیاسی اور سماجی نظریے کی حد تک ترقی پسندی سے مجھے اس وقت بھی کوئی اختلاف نہیں تھا، اختلاف تھا تو صرف ادب پر اس کے اطلاق سے، اور ادب میں سیاسی نظریے کی آمریت سے۔ سجاد ظہیر اسی زمانے میں تازہ تازہ پاکستان سے واپس آئے تھے اور اس مقدمے بلکہ سازش کی تلخیاں ساتھ لائے تھے جو ان کے خلاف اس وقت کی حکومت پاکستان نے کی تھی۔ وہ موت کے مقابل کئی برس زنداں میں کاٹ چکے تھے۔ یہی تلخی ان کے جوابی مضمون میں در آئی تھی۔ انھیں میرے اختلاف کے پس پردہ امریکی سازش اور سی آئی اے کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے "جواب الجواب" میں اسی جدلیاتی منطق سے کام لیا جو مارکسی طرز فکر کی اساس ہے اور اسی کے وسیلے سے اس وقت کی ترقی پسند ادبی فکر کے تضادات کو نمایاں کیا۔ یہ بحث بہت دنوں تک ہندوستان و پاکستان کے ادبی جرائد کے صفحات پر چلتی رہی۔ لیکن آج بھی مجھے اس بات پر طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ میں نے اپنے مضامین میں شخصی حملوں کو روا نہیں رکھا۔ سجاد ظہیر نے شخصی طور پر مجھے جانے بغیر میرے خلاف ایسی باتیں بھی لکھ دی تھیں جو ان جیسی شخصیت کو زیب نہیں دیتی تھیں۔ اس تلخی کو میں اس وقت ذہن سے نہ اتار سکا لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک اور مارکسزم سے ذہنی اور جذباتی طور پر اتنے وابستہ تھے کہ اس پر ذرا سی آنچ آتی دیکھ کر برہم ہو جاتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی یہ شدید وابستگی آخر وقت تک قائم رہی۔ انھوں نے اس کے احیا کے لئے بڑے پیمانے پر تمام ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں کی ایک کل ہند کانفرنس بھی کی۔ لیکن شاید ان کے قریبی رفقا میں سے کسی کا تنظیم پر اتنا مستحکم ایمان نہیں رہا تھا جیسا ان کا تھا۔ پھر کمیونسٹ تحریک کے اندرونی نظریاتی اختلافات بھی ابھر کر اس قدر سامنے آ چکے تھے کہ سجاد ظہیر انجمن کو اتنا مضبوط اور فعال نہ بنا سکے جیسی وہ ماضی میں رہ چکی تھی۔ انجمن کی تنظیم سے وسیع پیمانے پر ادیبوں کی عدم دلچسپی کچھ تو ادبی رویے اور نظر کی تبدیلی کا نتیجہ تھی، کچھ ترقی پسندی کی تعبیر سے اختلاف کا نتیجہ۔ سنہ ۵۶ء کے بعد ہی سے آہستہ آہستہ یہ اختلاف ادیبوں میں محسوس کیا جانے لگا تھا۔ میں نے اپنی "سخن گسترانہ بات" میں ادب کے اسی بدلتے ہوئے مزاج کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر راسخ عقیدہ ادعائیت کے پیروؤں پر یہی کھلا ہو سکتا ہے اور ادعائیت ہر نئے خیال کو خوف کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ادیبوں کی پرانی اور نئی نسل کا تنازعہ ادعائیت اور تشکیک کا مقابلہ تھا۔ سجاد ظہیر نے اس پر بند باندھنے کی کوشش کی تو سیلاب رکنے کے بجائے حدوں کو توڑ کر باہر نکل آیا۔ سجاد ظہیر

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

وحید اختر

میرا صفحہ

میں ۱۴/اکتوبر کی صبح سری نگر (کشمیر) پہنچا تو ریڈیو کشمیر کے اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر عزیز قریشی نے سجاد ظہیر کے سلسلے میں کسی تقریر کا ذکر کیا۔ میں نے پوچھا "کیا وہ کشمیر میں ہیں" جواب ملا کہ "آپ کو خبر نہیں، ان کا تو انتقال ہو گیا" پھر جگن ناتھ آزاد سے تو ان سے کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں۔ یہ خبر اتنی اچانک، اور غیر متوقع تھی کہ راویوں کے معتبر ہونے کے باوجود اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ۱۵/کو ریڈیو کشمیر کے مشاعرے کے آغاز میں ایک قرارداد تعزیت پیش کی گئی۔ ۱۷/اکتوبر کو ٹیلی ویژن کے مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد نے بھائی پر اپنی تازہ نظم سنائی۔ الما آتا، جہاں سجاد ظہیر نے آخری سانس لی، اور دلّی، جہاں وہ سپرد خاک ہوئے، دونوں ہی شہر سری نگر سے دور ہیں، مگر اس موت کا سایہ سری نگر پر بھی اتنا ہی گہرا تھا جتنا کہیں اور ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے وہ خطّے جہاں جہاں امن اور ترقی پسند تحریک کے چراغ جلے ہیں سجاد ظہیر کے سوگ میں سیہ پوش ہوں گے۔

سجاد ظہیر کی موت اردو ادب کے ایک دور کا خاتمہ ہے۔ کہنے کو یہ بات ہر مرنے والے ادیب، شاعر یا سیاست داں کے لئے کہی جاتی ہے، مگر جتنی سجاد ظہیر پر صادق آتی ہے بہت کم لوگوں پر صادق آسکتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے صرف اردو کی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ترقی پسند تحریک کا آغاز بھی تھے اور نقطۂ عروج بھی۔ ان کی شخصیت میں اس تحریک کی انسان دوستی، جمہوریت پسندی، ادبی بصیرت، تنقیدی شعور ایک نقطے پر مرتکز ہو گئے تھے۔ وہ واقعی اپنی ذات سے انجمن تھے۔ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے دردمند تبسم، ان کے چہرے کی معصوم شگفتگی اور ان کے لہجے کی دلنوازی سے مسحور ہو جاتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت میں ان کے اخلاق و انکسار اور ان کی دل سوزی و دردمندی نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔

موجودہ صدی کے پانچویں اور چھٹے دہوں میں ہوش سنبھالنے والے ادیبوں کی نسلوں پر ترقی پسند تحریک کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ حیدرآباد میں مخدوم الف لیلوی شہزادے کی سی حیثیت رکھتے تھے جو اپنے گوہر مقصود کی تلاش میں دشت در دشت، قلعہ در قلعہ جنوں اور دیووں سے جنگ کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز اخبار میں مخدوم کی گرفتاری کی خبر آئی ہے، حمایت علی شاعر نے، جو اب پاکستان میں، اورنگ آباد کی ایک معروف سڑک پر غم و غصّہ کی شدت سے اخبار کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اسی طرح کا ردّعمل بہت سے ادیبوں کا اس وقت بھی ہوا جب فیض اور سجاد ظہیر کی پاکستان میں گرفتاری کی خبر ملی۔ مخدوم ہوں یا سجاد ظہیر، دونوں بائیں بازو کے خیالات رکھنے والے دانشوروں، ادیبوں اور طلبہ کے لئے علامتی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ علامت تھے استحصال اور ظلم کے خلاف ہم سب کی جدوجہد کے۔ وہ علامت تھے نئے خیالات و تصورات کے فروغ اور مستقبل کے منصفانہ سماج کے قیام و استحکام کی۔ ان سے ہمارا رشتہ محض ادبی نہیں تھا بلکہ وہ ہمارے باغیانہ جذبات کے زندہ پیکر تھے۔ اسی لئے جب ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ نئی نسل کی بغاوت کو ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھتے یا ان کے اختلاف کے حق کو تسلیم نہیں کرتے تو ہمیں بہت سے آدرشوں کے ٹوٹنے کا احساس ہوا۔ مخدوم کی رہائی اور سجاد ظہیر کی پاکستان سے واپسی کے بعد دونوں ہی سے میرے شخصی مراسم رہے۔ بحثیں ہوئیں تلخ و تند بھی اور باتیں ہوئیں مخلصانہ و دوستانہ بھی۔ وہ لوگ جو ملنے سے پہلے ذہن میں ایک مثالی پیکر بن چکے ہوں جب گوشت پوست میں اپنی انسانی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ ملتے ہیں تو خیال پرست ذہن ان کے تصوراتی پیکر اور حقیقی وجود

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر ہماری زبان انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا